اصول سیاست و اخلاق و قانون

(مولانا ابو الاعلیٰ مودودی)

میں عرض کر چکا ہوں کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک علم۔ دوسرے عمل علم سے مراد یہ ہے کہ انسان اس سے آگاہ اور باخبر ہو کہ اسلام کیا ہے؟ اس کی تعلیم کیا ہے؟ وہ کس چیز کی طرف دعوت دیتا ہے؟ اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لئے؟ وہ کیا دستور العمل پیش کرتا ہے عمل سے مراد یہ ہے کہ اسلام نے عبادات، اخلاق معاشرت اور سیاست کے متعلق جو اصول اور قوانین مقرر کئے ہیں ان پر عمل درآمد کیا جائے

مفید نتیجہ پیدا کرنے کے لئے ان دونوں چیزوں کا ساتھ ساتھ ہونا ضروری ہے لیکن ان دونوں میں علم مقدم ہے کیونکہ عمل بغیر علم کے نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ہو بھی تو ٹھیک ٹھیک جیسا ہونا چاہئے ویسا نہیں ہو سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ علم بلا عمل بھی مفید نہیں ہے، مگر جو شخص علم رکھتا ہے اس سے ــــــ یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اس کے عمل میں کسی نہ کسی حد تک اس کے علم کا اثر بھی ضرور آئے گا۔

علم کی بنیاد قرآن ہے۔ اس کتاب پاک میں وہ تمام اصول اور قوانین بیان کر دیئے گئے ہیں جن پر اسلام کا مدار ہے۔ لہذا ایک مسلمان کو سب سے پہلے قرآن کو سمجھنا اور اس کی تعلیمات سے باخبر ہونا چاہئے۔ پھر علم کا دوسرا سرچشمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ آپ نے ایک نبی کی حیثیت سے ۲۳ سال تک جو کچھ کیا اور جو کچھ کہا ہے وہ سب قرآن کی تفسیر ہے، اور دراصل قرآن کی حقیقی اور مستند تفسیر وہی ہے علم کا تیسرا سرچشمہ صحابۂ کرام کی زندگی ہے۔ انہوں نے قرآن کو خود حامل قرآن سے سمجھا

اور قرآن کی علمی اور عملی تفسیر خود اپنی آنکھوں سے دیکھی اور اپنے کانوں سے سنی ہے، اس لئے ان کا سمجھنا دوسروں کی سمجھنے سے زیادہ صحیح اور معتبر ہے پھر جو لوگ ان تینوں سرچشموں سے استفادہ کرکے اسلام کے اصول اور زندگی کے جزئی مسائل پر ان کو منطبق کرنے کے طریقوں کو اچھی طرح سمجھ لیں ان میں یہ قابلیت پیدا ہو جاتی ہے کہ زندگی کے عام معاملات میں جو ہر ملک اور ہر زمانے میں نئے ڈھنگ اور نئے طور سے پیش آتے ہیں اصول اسلام کے مطابق احکام اور قوانین بنا سکیں کیونکہ جو علم انہوں نے قرآن اور سنت رسول اور اسوۂ صحابہ سے حاصل کیا ہے اس سے وہ اسلام کی روح تک پہنچ گئے ہیں اور ان میں یہ استعداد پیدا ہو گئی ہے کہ جب کبھی کوئی ایسا نیا معاملہ ان کے سامنے آئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کے زمانہ میں پیش نہیں آیا تو وہ یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس معاملہ میں رسول اللہ صلعم کا فتویٰ کیا ہوتا یا اگر صحابہ کے سامنے یہی معاملہ آتا تو وہ کیا طرز عمل اختیار فرماتے یہی چیز کا نام اجتہاد ہے

اس ترتیب میں قرآن سب سے مقدم ہے، پھر سنت رسول اللہ، پھر اسوۂ صحابہ پھر اہل علم کا اجتہاد لیکن بدقسمتی دیکھئے کہ آجکل اور نہ صرف آجکل بلکہ گذشتہ کئی صدیوں سے مسلمانوں کے جہلا نے نہیں علما نے اس ترتیب کو بالکل الٹ دیا ہے۔ وہ طلب علم میں اپنی ساری توجہ ان اہل علم کی کتابوں پر صرف کرتے ہیں جنہوں نے اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اپنی ذہانت اور فہم و بصیرت اور اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق اجتہاد کرکے اسلام کے عقاید اور قوانین کی تشریح و توضیح کی ہے اس کے بعد تھوڑی بہت کوشش سنت رسول اور اسوۂ صحابہ کا علم حاصل کرنے میں بھی صرف کی جاتی ہے لیکن سب سے کم توجہ اور عنایت جس چیز کے حصہ میں آتی ہے وہ قرآن ہے۔ آپ مذہبی تعلیم کے کسی نصاب کو اٹھا کر دیکھ لیجئے، آپ کو اس میں سب سے زیادہ فقہ، اصول، عقائد، کلام کی کتابیں ملیں گی اس کے بعد احادیث و آثار کا نمبر آئیگا مگر آپ محسوس کریں گے کہ ہر نصاب میں یہ مضمون صرف اس غرض کے لئے رکھا گیا ہے کہ اس سے

اللہ کا بندہ خود اللہ کی کتاب اور اس کے اقوال و اعمال پر نگاہ ڈال کر یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ اگر وہاں فروع میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس مسئلہ میں ہماری رہنمائی کر سکتی ہو تو اصول میں کونسی اصل ہے جس سے اس مسئلہ میں ایک جدید فرع نکالی جا سکتی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برسوں کی کوششوں اور کاوشوں کے بعد بھی نہ ہماری آنکھوں میں اتنی قوت بینائی پیدا ہوتی ہے کہ خود رات کے نشانات دیکھ سکیں نہ ہمارے پاؤں میں اتنی طاقت آتی ہے کہ اپنے بل بوتے پر آپ کھڑے ہوں اور استقلال کے ساتھ چل سکیں۔ اس لئے اس پر ہمیشہ مجبور رہتے ہیں کہ کوئی طاقت ور بندہ خدا مل جائے تو ہمیں گود میں اٹھا کر لے چلے۔

اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ پچھلے مجتہدین یا ان میں سے کسی ایک کی تقلید کرنے کو ناجائز ٹھیراؤں یا انھوں سے اپنے علم اور اپنی ذہنی قابلیتوں سے اسلام کی جو خدمات کی ہیں ان کو بے کار قرار دوں۔ حاشا کہ میرے دل میں اس کا خیال بھی آیا ہو۔ میرا احترام دراصل اس ترتیب پر ہے جو تقدم اور تاخر کے معاملہ میں اختیار کرنی گئی ہے۔ میرے نزدیک دینی تعلیم میں سب سے مقدم قرآن ہونا چاہئے اور کوشش کرنی چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے معانی اور اس کی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ سمجھا جائے۔ اس کے بعد سنت رسول اور اسوۂ صحابہ کا مطالعہ ہونا چاہئے اور اس مطالعہ میں پڑھنے والے کی یہ کوشش ہونی چاہئے کہ وہ اپنے آپ ذہنی طور پر قرن اول کے مکہ اور مدینہ کی گلیوں میں پہنچا دے اور قریب سے قریب تر مقام پر پہنچ کر رسول اللہ اور آپ کے صحابہ کے آثار ملاحظہ کرے، اور اس بصیرت کے ساتھ ملاحظہ کرے کہ ان آثار میں جو اصول ہیں وہ الگ الگ ذہن نشین ہوتے جائیں، جو فروع ہیں وہ اپنی اپنی اصل کے ماتحت اس مقام پر درج ہوں جو مقام خود رسول اکرم اور صحابہ نے ان کو دیا تھا اور ان سب کے ساتھ تعلیم اسلام کا رابطہ جس نوعیت کا تھا وہ مجموعی طور پر سامنے آجائے۔ اس گہرائی کے ساتھ قرآن اور اس کی حقیقی تفسیر کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک طالب علم کو دیکھنا چاہئے کہ

اُس خاص فقہی وکلامی مذہب کی تائید حاصل کیجائے جس کے پیرؤں نے وہ نصاب بنایا ہے، رہا احادیث و آثار پر عبور اور اس سے اجتہاد کی قابلیت پیدا ہونا، تو یہ نہ کسی کا مقصود ہے اور نہ کسی نصاب سے یہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ آخر میں قرآن کا نمبر آئیگا اور یہاں آپ دیکھینگے کہ خود قرآن تو کسی نصاب میں داخل ہی نہیں ہے البتہ اس کی بعض تفسیریں داخل ہیں مگر وہ ایسی تفسیریں ہیں جن سے قرآن کی روح اور اس کے مغز تک پہنچنا مشکل ہے اور اس پر غضب یہ کہ اکثر نصابوں میں یہ تفسیریں بھی پوری شریک نہیں ہیں۔[1]

اس غلط تعلیم کا نتیجہ تقلید جامد اور گروہ بندیوں کی شکل میں نمودار ہوا ہے ہمارے جہلا تو درکنار ہمارے علماء کا بھی بیشتر حصہ اسلام کی اصلی روح اور اسکی صحیح تعلیم سے بے بہرہ ہو گیا ہے۔ وہ براہ راست خدائی بھیجی ہوئی شمع ہدایت سے روشنی حاصل نہیں کرتے، بلکہ اس شمع سے جو مختلف چراغ روشن ہوئے ہیں ان کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے ہیں اور ہر گروہ اپنے منظور نظر چراغ کو اصلی شمع ہدایت سمجھنے لگا ہے۔ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ۔ لوگوں نے فروع کو اصول کی جگہ دیدی ہے اور اصول کو فروع کا درجہ دینے لگے ہیں۔ ایک صراط مستقیم سے مڑ کر مختلف پگ ڈنڈیوں پر ہو لیے ہیں۔ اور ہر گروہ صرف اپنی پگ ڈنڈی کو اصلی صراط مستقیم سمجھنے لگا ہے براہ راست کتاب اللہ اور سنت رسول سے استفادہ نہ کرنے اور سراسر فقہاء و مجتہدین کی رہنمائی پر اعتماد کرنے کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ صدیوں سے ہم میں مجتہد پیدا ہونے بند ہو گئے ہیں۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو طلب علم میں عمریں بسر کر دیتے ہیں۔ مگر ہزاروں لاکھوں میں ایک صاحب علم بھی ایسا نہیں نکلتا جو اصول اسلام کو ٹھیک ٹھیک سمجھکر نئے حالات اور نئی ضروریات پر ان کو منطبق کر سکے، اور جدید پیدا شدہ جزئی مسائل میں نئے قوانین کا استنباط کر سکے۔ ہر مسئلہ جب سامنے آتا ہے تو نظریں پچھلے علماء کی طرف اٹھتی ہیں اور کوئی

---

[1] میں نے یہاں عمومیت کے ساتھ تمام نصابوں پر حکم لگایا ہے۔ اگرچہ میں اس سے بے خبر نہیں ہوں کہ اس کلیہ میں کچھ مستثنیات بھی ہیں لیکن سواد اعظم پر ان مستثنیات کا کوئی اثر نہیں ہے۔

تمدن وتہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ جب معاملات نے وسعت اختیار کی نئی نئی ضروریات پیش آئیں۔ اور عقلی علوم کی اشاعت سے دین کے متعلق نئے نئے مسائل پیدا ہونے لگے، تو گذشتہ زمانے کے علماء نے کس طرح اصول سے فروع کا استنباط کیا، کلیات سے جزئیات نکالے، معاملات کے لئے فقہی قوانین مرتب کئے اور عقاید کی تشریح وتوضیح کی۔ اس ترتیب کے ساتھ جب علم کا اکتساب کیا جائیگا تو اندھی تقلید اپنی مضرتوں سمیت ختم ہو جائیگی جس حد تک پچھلے مجتہدین کے اجتہادات ہمارے لئے کافی ہیں اس حد تک ہم ان کا اتباع کریں گے۔ اور جن معاملات میں وہ کافی نہیں ہیں انمیں ہم خود اجتہاد کرکے کتاب اللہ اور سنت رسول سے مسائل کا استنباط کرسکیں گے۔ نیز اس سے گروہ بندیاں بھی اپنی اس شدت کیساتھ باقی نہ رہیں گی جو انہوں نے بعد کے زمانہ میں اختیار کرلی ہیں کیونکہ جو لوگ اس طریقہ سے علم دین کا مطالعہ کریں گے ان کو اچھی طرح معلوم ہو جائیگا کہ دین کے اصول کیا ہیں۔ اور فروع کیا ہیں؟ اصول میں اختلاف کیا معنی رکھتا ہے اور فروع میں اختلاف کی کیا حیثیت ہے؟ کفر کیا ہے اور اسلام کی حدود کہاں تک وسیع ہیں؟ کفر و اسلام کا امتیاز کن اصول پر مبنی ہے؟ ایک شخص مرکز اسلام سے دور ہٹ جانے کے باوجود کس حد تک دائرہ اسلام میں رہتا ہے اور کہاں پہنچ کر اس دائرہ سے باہر ہو جاتا ہے؟ اور جو شخص دائرہ اسلام کے اندر مگر ہماری رائے میں مرکز سے دور ہٹ گیا ہو اس کے ساتھ ہمارا کیا برتاؤ ہونا چاہئے؟

مگر خرابی تو یہ ہے کہ تعلیم میں قرآن پر حدیث اور حدیث پر فقہ، عقائد اور کلام کو جو ترجیح دیجاتی ہے، وہ محض بھوال چوک کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ ایک بڑی سوچی سمجھی ہوئی غلط فہمی کا نتیجہ ہے لوگوں نے دیکھا کہ اسلام میں جتنے فرقے پیدا ہوئے ہیں وہ سب اولاً قرآن سے اور ثانیاً حدیث و آثار سے استدلال کرتے ہیں، اور قرآن مجید کی آیات اور احادیث و آثار کو اپنے مطلب کے معنی پہنا کر ان پر اپنے مذہب کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اس بنا پر گو علی الاعلان یہ نہیں کہا جاتا مگر عملاً یہ سمجھ لیا گیا ہے اور دبی زبان سے کہ

بھی دیا جاتا ہے کہ اختلاف کا سب سے بڑا سرچشمہ قرآن ہے، اور اس کے بعد احادیث و آثار ہیں۔ یہ خیال کر کے علماء کے ایک بڑے گروہ نے اپنے نزدیک عافیت اس میں دیکھی کہ دینی تعلیم کو صرف ان کتابوں تک محدود رکھا جائے جو خاص اپنے مذہب کے مطابق فقہ عقاید اور کلام کے مباحث پر لکھی گئی ہوں۔ احادیث و آثار کو اس حد تک پڑھایا جائے جس حد تک وہ اپنے مذہب کے لئے سند کا کام دے سکیں۔ اور قرآن مجید کو صرف تبرک کے طور پر پڑھ لیا جائے۔

یہاں اس تفصیل کا موقع نہیں کہ یہ غلط فہمی کن اسباب سے پیدا ہوئی اور کس طرح اس نے زور پکڑا۔ اس کی تفصیل ایک مستقل کتاب کی وسعت چاہتی ہے۔ کیونکہ گو یا اسلام میں فرقوں کی پیدائش کی تاریخ ہے میں صرف واقعہ کی حد تک اس کو تسلیم کروں گا بلاشبہ تفرقہ کی بنیاد قرآن اور سنت رسول پر رکھی گئی ہے لیکن مجھے اس کے ماننے سے انکار ہے کہ اس کی ذمہ داری قرآن یا سنت رسول پر ہے۔ قرآن اور اس کے لانے والے نے تو ایک ہی دین اور ایک ہی سیدھا اور صاف راستہ پیش کیا ہے اور اس کی تو اصل دعوت یہ ہے کہ اس راہ راست میں تفریق نہ کرو۔ وہ تو کہتا ہے کہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (۳ : ۱۱) اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور گروہ گروہ نہ بن جاؤ۔ اور اَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ (۴۲ : ۲) دین کو قائم کرو اور اس میں پراگندہ نہ ہو جاؤ۔ وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ (۶ : ۱۹) یہ میری سیدھی راہ ہے اس پر چلو اور الگ الگ راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمہیں پراگندہ کر کے اللہ کی سیدھی راہ سے ہٹا دیں گے وَأَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ (۸ : ۶) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑے نہ برپا کرو کہ اس طرح تمہاری ہمتیں ٹوٹ جائیں گی اور تمہاری ہوا

اکھڑ جائے گی۔ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۳ : ۲) اور ان کوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جنہوں نے کھلی آیتوں کے آنے کے بعد تفرقے اور اختلاف برپا کئے کہ ایسے لوگوں کے لئے بڑا عذاب ہے إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶ : ۲۰) جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ برپا کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے۔ ان سے اے محمد تمہارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ پھر وہ احسان جتاتا ہے کہ اللہ نے تم کو سیدھی راہ دکھا کر آپس کے تفرقوں اور باہمی عداوتوں سے بچا لیا۔ اور تم سب کو بھائی بھائی بنا دیا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا (۳ : ۱۱)۔

لوگو! اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈالدی اور اس کی نعمت سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے گڑھے کے کنارے پر تھے اس نے تم کو اس سے بچا لیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تفرق فی الدین کی ذمہ داری قرآن اور رسول پر نہیں ہے، اور ہر وہ شخص جو قرآن اور اس کے لانے والے کو سچا مانتا ہے۔ اسے تسلیم کرنا چاہئے کہ یہ دونوں (جو حقیقت میں ایک ہی ہیں) اس ذمہ داری سے بری ہیں۔ مگر جب یہ واقعہ ہے کہ اختلاف کی نہریں کتاب و سنت ہی کے سرچشمے سے پھوٹتی ہیں تو غور کرنا چاہئے کہ آیا یہ واقعہ قرآن کے دعوے کی تکذیب کرتا ہے یا درحقیقت اس واقعہ سے قرآن کے دعوے پر کوئی اثر نہیں پڑتا؟ اور قرآن و سنت سے پیدا ہونے والا اختلاف باعتبار حقیقت اس اختلاف سے بالکل جداگانہ ہے جس کی بدولت دین میں تفریق واقع ہوتی ہے۔

اختلاف کی جتنی شکلیں دنیا میں نظر آتی ہیں، ان سب پر نگاہ ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ ان کو دو بڑی قسموں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک قسم کا اختلاف تو یہ ہے کہ دو یا بہت سی چیزیں اصل اور بنیاد میں متحد ہوں مگر چند ظاہری امور میں ان کے درمیان اختلاف ہو۔ اور دوسری قسم کا اختلاف یہ ہے کہ ان کے درمیان اصلی اور بنیادی اختلاف ہو۔ مثلاً ایک اختلاف پانی اور برف کا اختلاف ہے اور دوسرا اختلاف پتھر اور پانی کا ہے۔ ایک اختلاف یہ ہے کہ ایک ہی جسم کا ایک سرا مشرق کی طرف ہے دوسرا مغرب کی طرف۔ اور ایک اختلاف یہ ہے کہ دو الگ الگ جسم ہیں جن میں سے ایک کا رخ مشرق کی طرف ہے اور دوسرے کا رخ مغرب کی طرف۔ ایک اختلاف یہ ہے کہ دو آدمی ایک ہی سڑک پر ایک ہی سمت میں چل رہے ہیں مگر ایک دائیں کنارے پر ہے دوسرا بائیں کنارے پر، ایک سوار ہے دوسرا پیدل، ایک تیز چل رہا ہے دوسرا سست۔ اور ایک اختلاف یہ ہے کہ دو آدمی دو الگ راستوں پر چل رہے ہیں۔ اور ایک مشرق سے مغرب کو جا رہا ہے دوسرا مغرب سے مشرق کو۔ ایک اختلاف یہ ہے کہ ایک ہی قوم کے مختلف گروہ رسم و رواج معاشرت کے طریقوں اور معاشی حالات کے اختلاف کی وجہ سے مختلف طبقات پر منقسم ہوں مگر من حیث القوم ایک ہوں۔ اور ایک اختلاف یہ ہے کہ دو مختلف قومیں اپنے ملکی حدود تہذیب، تمدن، سیاست اور حکومت کے اعتبار سے مختلف ہوں اور ان کے درمیان کوئی ایسا رشتہ اور تعلق نہ ہو جو انہیں ایک دوسرے سے ملے رہنے پر مجبور کرے۔

اختلاف کی یہی دونوں قسمیں مذہبی معاملات میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ایک قسم کا اختلاف تو یہ ہے کہ دو آدمی یا دو گروہ ایک ہی دین کے پیرو ہیں۔ اس کے اصلی اور بنیادی امور میں متفق ہیں۔ مگر عقاید اور عبادات و معاملات کے جزئیات میں ان کے درمیان اختلاف ہے اور یہ اختلاف ان کو دین کے مشترک امور میں متفق ہونے سے باز نہیں رکھتا۔

دونوں میں سے ہر ایک نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھتا ہے کہ دین کے فلاں حکم کی جو تعبیر اس نے کی ہے وہی صحیح ہے، مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ مخالف گروہ نے جو تعبیر کی ہے۔ وہ اس دین کے دائرے سے خارج کر دیتی ہے اور ہمارا آپس کا اختلاف صرف اس مسئلہ کی حد تک ہے۔ دوسری قسم کا اختلاف یہ ہے کہ دو گروہوں کے درمیان جس مذہبی مسئلہ میں اختلاف ہو اس کو وہ دین کا بنیادی سوال بنالیں، دونوں ایک دوسرے کو گمراہ اور بے دین سمجھیں، اور ان کے درمیان کوئی ایسا امر مشترک باقی ہی نہ رہے۔ جس میں وہ باہم مجتمع ہو سکتے ہوں۔

پہلی قسم کا اختلاف رائے ایک فطری اختلاف ہے دنیا کے تمام نظری اور عملی مسائل میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں بتایا جا سکتا جس میں انسانی فطرت نے اس طرح کے اختلاف رائے اور اختلاف عمل کی شکل میں ظہور نہ کیا ہو۔ ہر معاملہ میں ہم یہی دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے عقائد مختلف ہیں، خیالات مختلف ہیں، طریقے مختلف ہیں اور ان سب کی وجہ یہ ہے کہ ان کے طبائع مختلف ہیں، نہ سب لوگ ایک طرح سے سوچتے ہیں، نہ ایک طرح سمجھتے ہیں، نہ ایک ہی زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں نہ ایک طرح سے اثر اور فعل کرتے ہیں۔ اور نہ ایک ہی طرح متاثر اور منفعل ہوتے ہیں۔ ایک ہی واقعہ کا ایک شخص پر کچھ اثر پڑتا ہے۔ اور دوسرے پر کچھ ایک ہی شے کو ایک شخص کسی نظر سے دیکھتا ہے اور دوسرا کسی اور نظر سے ایک ہی بات کے معنی ایک شخص کچھ سمجھتا ہے اور دوسرا کچھ اور۔ ایک ہی مقصد کے لئے ایک شخص ایک طریقہ اختیار کرتا ہے اور دوسرا کسی اور طریقہ سے کام لیتا ہے۔ ایک ہی فعل سے ایک شخص کا کچھ مقصد ہوتا ہے اور دوسرے کا کچھ اور غرض بنی آدم میں عقل و فہم اور افتاد طبع و انداز فکر کے لحاظ سے جتنا تفاوت ہے اتنا ہی ان کے خیالات اور ان کے طریقوں میں بھی فرق ہے۔

اس فطری اختلاف اور تفاوت کی وجہ سے قرآن اور سنت کے سمجھنے اور اس کے

مطابق عمل کرنے میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے اور ہوا ہے۔ گو قرآن کی آیات مفصل اور بیّن ہیں، اور رسول اکرم نے ان کے اقوال سے ان کے معانی کی اور زیادہ تشریح کر دی ہے اور اپنے اعمال سے ان کا ایک واضح نمونہ پیش کر دیا ہے۔ مگر اس کے باوجود انسانی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ ہر آیت اور حدیث کے معنی سب لوگ ایک ہی نہ سمجھیں اور ہر عمل اور نمونے کو سب لوگ ایک ہی طرح نہ دیکھیں۔ اس فہم و نظر کے اختلاف کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کی بھی مختلف صورتیں پائی جائیں گی مثلاً

کچھ لوگ پہلے سے کوئی خاص رائے قائم کئے بغیر ایک آیت اور ایک حدیث کے معنی و مفہوم اور مقصد و مدعا کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے ذہن میں پہلے سے کچھ خیالات جمے ہوئے ہوتے ہیں، پھر وہ انہی خیالات کے مطابق آیات و احادیث کی تاویل کر لیتے ہیں۔

کچھ لوگ سلیم الفطرت اور صحیح الفکر ہوتے ہیں۔ وہ ہر چیز کا سیدھا اور صاف مفہوم لیتے ہیں۔ صرف کام کی بات لے لیتے ہیں۔ ان باتوں سے تعرض نہیں کرتے جن میں پڑنے سے کوئی فائدہ نہ ہو۔ بخلاف اس کے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جن کے دماغ میں الجھاؤ ہوتا ہے، کسی چیز کو سیدھے اور صاف طریقے سے پہنچ اور سمجھ ہی نہیں سکتے ہر چیز کو ٹیڑھی اور ٹیڑھی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور کام کی باتوں کو چھوڑ کر بے کار باتوں میں الجھ جاتے ہیں۔

کچھ لوگوں کی نظر گہری، سمجھ تیز، عقل رسا، فکر بالغ ہوتی ہے۔ وہ بات کی تہ کو پہنچ جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی نظریں سطحی ہوتی ہیں عقل میں رسائی اور سمجھ میں تیزی نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ صرف ظاہر کو دیکھ سکتے ہیں۔ اور باطن تک نہیں پہونچ سکتے۔ اسی طرح لوگوں کے مبلغ علم میں اختلاف ہوتا ہے بعض لوگوں کے پاس ذرائع معلومات وسیع ہوتے ہیں۔ اور بعض لوگوں کا علم محدود ہوتا ہے۔

کچھ لوگوں کے مزاج میں اعتدال ہوتا ہے، وہ شدت اور افراط و تفریط سے بچے رہتے ہیں بخلاف اس کے کچھ لوگ فطرۃً انتہا پسند ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ مرکز سے ہٹ کر کسی ایک جانب جھک پڑتے ہیں۔ اور انتہا کو پہنچ جاتے ہیں۔

ان مختلف صورتوں میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جو دین میں رخنہ ڈالنے والی ہو اگر بدنیتی شامل نہ ہو تو خواہ کتنے ہی مختلف وجوہ سے قرآن اور سنت کی تاویل کیجائے اس پر غلطی کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ مگر بے دینی کا حکم نہیں لگایا جا سکتا ہے اور بدنیتی کا معاملہ ایسا ہے کہ اس میں قطعیت کے ساتھ حکم لگانا آدمی کے لئے مشکل ہے۔ کیونکہ نیتوں کا حال خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا ہم صرف ظاہری علامات کو دیکھ کر کسی کے متعلق یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ اس نے بدنیتی کے ساتھ ایسا کیا ہے لیکن اس میں کسی نہ کسی حد تک یہ امکان ضرور باقی رہتا ہے کہ شاید اس نے کج فہمی، بالغباوت ذہن یا انتہا پسندی کی بنا پر ایسا کیا ہو۔ علاوہ بریں یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ایک واقعی بدنیت شخص نے کتاب و سنت کی غلط تاویل کر کے جو مذہب نکال لیا ہو اس کے پیرو بھی واقعی بدنیت ہوں ہو سکتا ہے کہ انہوں نے نادانی مگر نیک نیتی کے ساتھ اس کی پیروی اختیار کی ہو لہٰذا عقائد اور عملی طریقوں کے اختلاف میں نیت کے سوال سے قطع نظر کر کے صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ اختلاف اصل اور بنیاد میں ہے یا فروع اور جزئیات میں اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ قرآن اور سنت نے اصل اور بنیاد یعنی الدین اور صراط مستقیم میں کسی اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رکھی ہے، البتہ فروع اور جزئیات یعنی مسالک اور مناہج میں اختلاف کی گنجائش چھوڑ دی ہے تاکہ ہر شخص دین کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی قابلیت اور استعداد اور رجحان طبع کے لحاظ سے جس معنے و مفہوم کو سمجھ سکتا ہو سمجھے اور جس طریق پر مطمئن ہو سکتا ہو، اپنا اطمینان کرے اگرچہ اس میں بھی جو فروع اور جزئیات اہمیت رکھتے تھے ان میں زیادہ سے زیادہ ممکن توضیح و تشریح سے کام لیا،

مثال کے طور پر توحید ایک بنیادی عقیدہ ہے اس میں یہ گنجائش ہرگز نہیں چھوڑی گئی ہے کہ کوئی شخص خدا کو ایک سمجھے، کوئی دو، کوئی تین اور پھر بھی سب مسلمان رہیں خدا کے ایک ہونے پر سب کو ایمان لانا پڑے گا۔ البتہ اس وحدت کا جو مفہوم ایک پڑھا مسلمان سمجھتا ہے وہ ظاہر ہے کہ ایک دیہاتی نہیں سمجھ سکتا ایک فلسفی کے ذہن میں وحدت کے جو معنی ہوں گے وہ ایک عامی کے ذہن میں نہیں سما سکتے مگر اس کے مختلف معانی سمجھنے کے باوجود وہ جب تک خدا کو ایک سمجھتے ہیں۔ اس وقت تک ایک ہی اصل توحید پر متفق رہیں گے۔ اسی طرح ملائکہ کتب آسمانی یوم الدین، انبیاء و رسل کے معاملے میں جو اصل اور بنیادی اعتقاد قرآن و سنت نے پیش کیا ہے۔ اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص ملائکہ کے وجود سے انکار کر دے، یا کتب آسمانی کے کلام الٰہی ہونے کا منکر ہو یا یوم الدین کے آنے کو نہ مانے، یا رسالت کا اقرار نہ کرے، یا قرآن میں جن رسولوں کا نام بصراحت لیا گیا ہے ان میں سے کسی کی رسالت سے انکار کرے اور پھر مسلمان بھی رہے۔ لیکن ملائکہ وحی رسالت اور قیامت وغیرہ کی حقیقت اور ان کے معانی سمجھنے میں اختلاف ہونا ممکن ہے۔ اور جب تک کوئی شخص اصل عقیدہ سے انکار نہ کرے اس وقت تک وہ کسی تاویل کی بنا پر دین سے خارج نہیں ہو سکتا یہی حال اعمال کا ہے۔ خدا اور رسول نے جن اعمال کو فرض قرار دیا ہے یا جن کی تاکید فرمائی ہے یا جن کو حرام قرار دیا ہے، یا جن سے بتصریح منع فرمایا ہے انکے نفس فرض، یا نفس حرام، یا نفس موکد، یا نفس ممنوع ہونے میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے کوئی شخص فرض کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ حرام نہیں ہے البتہ اعمال کے طریقوں اور ان کی صورتوں میں اختلاف ہو سکتا ہے اور اس اختلاف سے اصل دین میں کوئی رخنہ نہیں پڑتا۔

پس قرآن اور سنت رسول اللہ سے جو اختلاف پیدا ہو وہ اصل دین کا اختلاف نہیں ہے جس سے تفرق فی الدین پیدا ہوتا ہو، بلکہ وہ مناہج اور مسالک میں آراء اور طریقوں کا فطری اختلاف ہے جس کے رونما ہونے سے حبل اللہ کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوتے، صراط مستقیم مختلف پگ ڈنڈیوں میں تقسیم نہیں ہوجاتی، ہدایت گمراہی میں نہیں بدل جاتی، ایک ملت کی کئی امتیں نہیں بن جاتیں۔ جماعت کا شیرازہ درہم برہم نہیں ہوتا اور وہ تنازع برپا نہیں ہوتا جس سے ہمتیں ٹوٹ جائیں اور ہوا اکھڑ جائے۔ یہ دوسری قسم کا اختلاف اور تفرقہ قرآن اور سنت سے پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ خواہشات اپنے نفس کی شرارتوں سے پیدا ہوا ہے اس کی ذمہ داری قرآن وسنت پر نہیں بلکہ قرآن وسنت سے غافل ہونے اور جاہل رہنے پر ہے اور یہ وہ تفرقہ و اختلاف ہے جسے پیدا کرنے کے لئے نہیں بلکہ مٹانے کے لئے قرآن اتارا گیا ہے۔ اور رسول کو مبعوث کیا گیا ہے۔

میرے کہنے کی غرض یہ ہے کہ دین میں اصل فتنہ، اختلاف کا فتنہ نہیں ہے تشیع اور تحزب اور تعصب کا فتنہ ہے۔ ہر گروہ کا صرف اپنے مذہب اپنے مسلک اپنے منہاج، اور اپنی شرکت کو اصل دین اور ایک ہی صراط مستقیم قرار دینا۔ دوسرے کو خارج از دین اور گم کردہ راہ سمجھنا اسلامی عصبیت کو چھوڑ کر فریقانہ عصبیت اختیار کرنا، آپس میں عداوت اور ایک دوسرے سے نزاع رکھنا، یہی اصلی فتنہ ہے، اس کو قرآن نے تفرق فی الدین سے تعبیر کیا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس سے بچنے کی قرآن میں بار بار تاکید کی گئی ہے اور اسی کے متعلق فرمایا ہے

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ

جو لوگ اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور گروہ گروہ بن جاتے ہیں ان سے تمہیں ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے اس دین کی وسعت ظاہر کرنے کے لئے اللہ نے

رسی سے تعبیر کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ تم اس رسی کو تھامے رہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خواہ تم نے اس رسی کو کسی کنارے سے پکڑا ہو یا بیچ میں سے، مشرق کی طرف سے یا مغرب کی طرف سے، سیدھے ہاتھ سے یا الٹے ہاتھ سے، بیٹھے بیٹھے یا کھڑے کھڑے، بہرحال جب تک اس رسی کو تم تھامے رہو گے تفرق اور پراگندگی سے محفوظ رہو گے اور جب تم میں کا ہر گروہ اپنی گرفت کی حد ختم ہوتے ہی اس کو کاٹ ڈالے گا۔ اور اس رسی کے مختلف ٹکڑے مختلف گروہوں میں بٹ جائیں گے تو پھر تم ہی نہیں بلکہ تمہارا دین بھی پراگندہ ہو جائے گا۔ دنیا میں تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور آخرت میں تمہارا یہ حال ہوگا کہ خود تمہارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تم سے کوئی واسطہ نہ ہوگا۔

پس مذاہب اور مناہج کے اختلاف کو دین کا اختلاف سمجھنا بنیادی غلطی ہے۔ دین تو ایک ہی ہے جس کو قرآن اور صاحب قرآن نے پیش کیا ہے۔ البتہ اس دین کو سمجھنے اور برتنے کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں اور ان طریقوں کا اختلاف فطری ہے۔ جس سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے قرآن خود کہتا ہے کہ لِكُلِّ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ (۲۲: ۹) ہم نے ہر گروہ کے لئے ایک طریقہ مقرر کر دیا ہے اور ہر گروہ اسی پر چلتا ہے۔ اور لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (۵: ۷) ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک طریقہ اور ایک راستہ مقرر کر دیا ہے۔ ان طریقوں کے اختلافات سے ڈر کر نفس قرآن کو جو اصل دین ہے، چھوڑ بیٹھنا اور اس سے غفلت برتنا کوئی عقلمندی نہیں ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے جزئیات و فروع میں تاویل و تعبیر کے اختلافات ضرور پیدا ہوں گے۔ مگر کلیات اور اصول جن پر دین کا مدار ہے لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہو جائیں گے۔ اور وہ جس قدر زیادہ جاگزیں ہوں گے اسی قدر تفرق فی الدین اور تحزب و تشیع کے فتنہ کا قلع قمع ہوگا۔